اقبال کی شاعری کے ارتقاء میں فطرت کی آمیزش

Mixture of Nature in the Evolution of Iqbal's Poetry.

ڈاکٹر روبینہ یاسمین،
اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور
ڈاکٹر رانی بیگم
لیکچرر اردو، ویمن یونیورسٹی مردان

Abstract:

Allama Muhammad Iqbal's poetry is very important compared to earlier, contemporary and later poetry. One of the reasons for this is that he made naturalism the main theme of his poetry. Iqbal is not only a naturalist poet, but he had also tried to make nature a revealed reality and besides being inspired and dedicated by the beauty of nature, he had taken the task of revealing the facts of life. He considered the beauty of nature as a source of insights related to man and humanity. Thus, according to Iqbal, the phenomena of nature has become the manifestations of different realities and insights. The article under review is the description of this summary.

کلیدی الفاظ: علامہ اقبال، فطرت پرستی، شیکسپیئر، ورڈزورتھ، ایمل زولا

اقبال کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ خالصتاً فطرت کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں فطرت کی متنوع جہتیں ارضی و سماوی رفعتوں کو چھو کر وسعتوں کے نئے در وا کرتی ہیں۔ انھوں نے شاعری کا حق ادا کرتے ہوئے کائنات کو اس طرح اپنی شاعری میں سمویا ہے کہ صرف ان کی شاعری کا مطالعہ بھی کیا جائے تو کائنات کے بہت سے سربستہ راز کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

ان کی شاعری میں فطرت کا کوئی نہ کوئی منظر طلوع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ فطرت کی طرف سے اقبال کے رویے میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور فطرت کی یہ رنگ آمیزی ارتقاء کے مراحل سے گزر کر زماں و مکاں کی ہر راہ سے گزرتی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ اسی اجمال کی تفصیل ہے ۔ فطرت نگاری کے موجد کے حوالے سے ناول نگاری کے فن میں اکیسویں صدی کے نصف آخر میں فرانسیسی ادیب ایملی ذولا(Emil Zola)کا نام سامنے آتا ہے۔ انگریزی آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

"Naturalism, a more deliberate kind of REALISM in novels, stories and plays. Usually involving view of human beings as passive , victims of natural forces and social environment.(1)"

شعر و ادب میں فطرت نگاری کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کلاسیکی ادب کے علاوہ الہامی کتب میں بھی فطرت نگاری کو مکمل فکری ترسیل کا اہم ترین ذریعہ بنایا گیا ہے یعنی عالمِ خارجی کے مظاہر میں بارہا بلیغ انداز میں مثالیں ملتی ہیں:

ترجمہ: "بے شک آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے اختلاف میں اور کشتیوں میں جو دریاؤں میں ان چیزوں کو لے کر چلتی ہیں جن سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے اور اس پانی میں جو اللہ تعالیٰ ابر سے اتارتا ہے اور جس سے زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اور اس میں پھیلا دیتا ہے۔ ہر طرح کے جاندار اور ہواؤں کے پلٹانے میں اور بادل میں جو زمین و آسمان کے درمیان مطیع ہیں، ان میں عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں"۔(2)

اس دلکش بیان میں بڑی خوبصورتی سے فطرت نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ فطرت کے نام سے ہی اقبال کا نام ذہن میں ابھرتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعرانہ فکر کی بدولت اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی کے یے فطرت کے مظاہر و مناظر کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں فطرت کے متعلق کئی طرح کے خیالات و نظریات ملتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں اقبال کو فطری مناظر و مظاہر سے گہرا لگاؤ نظر آتا ہے اور یہاں ان کا رویہ ایک فطرت دوست شاعر کا سا ہے جہاں فطری مناظر حقیقی شکل میں موجود ہیں، جو مغربی شعرا کے اثر کا نتیجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ مغربی فطرت پرست شعرا سے متاثر ہونے کے سبب اقبال کے ابتدائی دور کی شاعری میں فطرت پرستی کے کئی مرقعے ملتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں یہ عنصر کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے اور اقبال کی شاعری جیسے جیسے ارتقا کے منازل طے کرتی جاتی ہے، ان کا ذہن حسن سے حظ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس خوب صورت کائنات کے سربستہ رازوں کی تلاش میں مگن دکھائی دیتا ہے۔ یہ دور ان کی سعی اظہار، تلاش و تحقیق اور ارتقا کا لمحہ بن جاتا ہے جہاں مظاہر فطرت کی منظر نگاری کسی الگ مقصد کی تلاش کا وسیلہ بن کر سامنے آتی ہے اور یہاں فطرت محض ایک پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں اقبال کی شاعری میں فطرت نگاری ورڈزورتھ، کیٹس، بائرن، انیسؔ اور محمد حسین آزادؔ کے انداز کی نہیں ہے جسے نیچرل شاعری کہا جائے اور نہ نظیر اکبر آبادی کی منظر

نگاری کی مانند، بلکہ ان کے برعکس اقبال کے مناظر فطرت میں وسعت اور کشادگی ہے۔ وہ فطرت کے حسن کو کسی ایک جگہ یا مقام سے مخصوص نہیں کرتے۔

اقبال اپنے ذہنی تحریک کی بدولت خارجی محرکات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی دکھاتے ہیں اور اپنے وسعت مطالعہ سے اپنی شاعری کو نت نئے مضامین سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ اقبال کو ورڈزورتھ کی طرح شاعر فطرت سمجھتے ہوئے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اقبال ان سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں لیکن ان کی طرح فطرت نگار نہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں؛

> اس (ورڈزورتھ) فطرت نگار نے سارا زور فطرت کی رعنائیوں کی تصویر کشی پر صرف کر دیا۔ اقبال کا طریق کار اور طرز فکر دوسرا تھا، وہ سارا زور ذہن انسانی کے معیار حسن کو درست کرنے پر صرف کرتے ہیں تاکہ ذہن جمال فطرت کی رعنائیوں کا صحیح اور محکم طور پر احساس کر سکے۔۔۔ یہی جمالیات و اخلاقیات کے علاوہ فطرت و انسانیت کے درمیان مطابقت و موافقت کا وہ بہتر نسخہ ہے جس کی تلاش ورڈزورتھ کو تھی مگر اس کو دریافت کیا اقبال نے۔(3)

تاہم فطرت کے وسیع، بلند تر اور گہرے مفہوم کے تجسس میں ڈرامہ نگار شیکسپیئر کے شریک کار نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں "شیکسپیئر" کے نام سے ایک نظم میں ان کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے:

چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظ اسرار کو فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا ۔(4)

کیوں کہ اقبال کے نزدیک انھوں نے اپنے ڈراموں میں انسانی فطرت اور زندگی کی حقیقت کی نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں ترجمانی کی ہے۔ یوں اقبال کی مغرب کے رومانی شعرا سے اثر پزیری محض ان کی رومانوی انداز نظر کی ہی غماز نہیں بلکہ وہ اسے روح انسانی کے ارتقا کے لیے کام کرنے والے ذریعے کی کڑی سمجھتے ہیں۔

اقبال کے ابتدائی دور کی نظموں پر نظر ڈالیں تو اقبال ایک مفکر اور فلسفی سے زیادہ فن کار، شاعر اور مصور نظر آتے ہیں جس نے حسن فطرت اور خارجی مظاہر کے تذکرے اور تحسین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بانگ درا کا آغاز ہی "ہمالہ"، "گلِ رنگیں"، "ابرِ کوہسار" جیسی نظموں سے ہوتا ہے یوں آگے فطرت کے تمام خارجی مظاہر کا تذکرہ ملے گا جیسے "پرندے کی فریاد، ایک آرزو، ماہ نو، نالۂ فراق، طفلِ شیر خوار، موج دریا، بچہ اور شمع، چاند، صبح کا ستارہ، جگنو، ابر، ایک پرندہ اور جگنو، کنار راوی، روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، شعاع آفتاب، ابرِ کوہسار، تسخیر فطرتِ، شاعر، حقیقت حسن، چاند اور تارے، شبنم اور ستارے، نمود صبح،

پھول، چاند، اور لالہ صحرا وغیرہ جیسی نظمیں اقبال کے ہاں فطرت نگاری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اقبال نے ان کے ذریعے جہاں ایک طرف اپنا مافی الضمیر خوبی سے ادا کیا تو دوسری طرف فطرت کے حسن کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور اس ذوق جمال کو تسکین پہنچائی جو ابتدائی دور سے ان کی گھٹی میں پڑا تھا جو اقبال کی رومانوی طبعیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

بانگِ درا کی نظموں میں اقبال فطری مظاہر سے مخاطب ہو کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ دور اقبال کے فن و فکر میں تلاش و تشکیک کا دور بھی ہے کیونکہ مشرق کی بے عمل اور مجہول زندگی ناامیدی کا سبب بن رہی تھی اور پھر مغرب کی مادہ پرستی اور اخلاقی قدروں سے آزاد معاشرہ ان کو اور بھی بے چین کر گیا، یوں ان کی روح بے چین فسردہ اور بے زار نظر آتی ہے اور وہ مظاہر فطرت سے یک گونہ ہم آہنگی کے طالب دکھائی دیتے ہیں۔ نظام فطرت کے ساتھ راز داری کا سلسلہ بر قرار رکھتے ہوئے کبھی چاند تاروں سے محو ہمکلام ہوتے ہیں کبھی آسمان کی وسعتوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو کبھی فضاؤں سے پر تجسس سوالات کرتے ہیں۔ بانگِ درا کی نظم، "ماہِ نو" میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

؎قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگ درا
گوش انساں سن نہیں سکتا تیری آوازِ پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو
ہے وطن تیرا کدھر ، کس دیس کو جاتا ہے تو
ساتھ اے سیارہ ثابت نما لے چل مجھے
خار حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بے کل مجھے
نور کا طالب ہوں ، گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں۔(5)

پھر پھول سے مخاطب ہو کر اپنی خلش اور محرومی کا گلہ کرتے ہیں اور حقیقتِ گل جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ انھیں اس حسین پیکر اور اپنے درمیان ایک گہرا ربط محسوس ہوتا ہے۔ گل کی پتی میں بھی اقبال کو اسرار حیات کی جھلک نظر آتی ہے جو اکثر علم کے حیرت کدے میں نہیں ملتا۔

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اسکی نمود!
گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز زیست و بود (6)

ماحول سے بے زاری اور دنیا کے ہنگاموں اور شورشوں سے الگ تھلگ رہ کر وہ اپنی ذات کے خول اور فطرت کے پر سکون آغوش میں سمٹ کر زندگی کے شب و روز گزارنے کی آرزو کرتے ہیں۔اس سلسلے کی خوبصورت نظم "ایک آرزو" ہے:

"دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب !
کیا لطف انجمن کا ،جب دل ہی بجھ گیا ہوں
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر ، تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر ، یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
ہو ہاتھ کا سرہانہ ، سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت ،خلوت میں وہ ادا ہو
صف باندھے دونوں جانب ، بوٹے ہرے ہرے ہو
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کوہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو "(7)

یہاں لفظ محض لفظ نہیں رہے بلکہ ان کے اندر جذباتی و احساساتی امتزاج کے ساتھ پورا منظر آنکھوں میں بیٹھ جاتا ہے اور اقبال کا اس بھری دنیا میں خود کو تنہا سمجھنے کا احساس اور مظاہر فطرت میں پناہ گزینی میں ہمیں ان کا روحانی احساس غالب نظر آتا ہے۔یوں اقبال اپنے ابتدائی دور میں پہاڑ، سورج، پھول، باغ، ابر، چاند، ستارے اور شمع گویا ہر چیز سے مخاطب ہوتے ہیں کہ کوئی تو اسے راہ مطلب دکھادے اور اپنے کرب کو بھی حسین پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

؎تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے (8)

اقبال کے مناظر فطرت وسعت پاتے پاتے "بالِ جبرئیل" کی ایک لافانی نظم "لالہ صحرا" میں بھی جلوہ نما ہوتے ہیں۔"لالہ" اقبال کے نزدیک جوش ، نمو اور ذوق تخلیق کا مظہر ہے ۔ اقبال گل لالہ اور اپنے درمیان ایک گہرا ربط اور مناسبت تلاش کرتے ہیں جو جوش حیات سے سرشار ہو کر اپنے وجود کا ثبوت دیتا ہے۔

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا

اک جذبہ پیدائی ایک لذت یکتائی (9)

یوں اقبال انسان کو کائنات میں ترقی کرتے دیکھنے کے آرزو مند ہیں اور قدرت کے اسرار کے تجسس اور انکشاف کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بقول نعیم احمد:

> "اقبال کے فن کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کے اظہار میں گہرا اثر پیدا کرنے کے لیے فطرت کو ان افکار کے پس منظر کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔۔۔۔ جہاں شاعر نے اپنے احساسات کی شدت اور فکر کی وسعت کے اظہار سے پہلے نہایت چابک دستی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ فطرت کے سحر انگیز مناظر کی تصویر کھینچی ہے"(10)

یہاں اقبال فن اور زندگی کے بارے میں فلسفیانہ انداز فکر اختیار کرتے ہیں۔ حسن کا روایتی تصور جو مشرق کی شاعری کا موضوعِ خاص تھا اور جسے اقبال نے اپنے ابتدائی اور بے زاری کے زمانے میں اپنایا تھا، اب ان کی نگاہ میں بے معنی ہونے لگا۔ اس سلسلے میں نظم "جلوۂ حسن" ملاحظہ ہو:

جلوۂ حسن ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا
منظر عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا
دور ہوجاتی ہے ادراک کی خامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے
آہ !موجود بھی وہ حسن کہیں ہیں کہ نہیں
خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہیں کہ نہیں (11)

یہاں ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسن کا وجود حقیقتاً ہے کہاں ؟ کیا فطرت خود اتنی خوب صورت ہے کہ انسان کو اپنی طرف متوجہ کرے یا انسانی آنکھ ہی ہے جو اس میں حسن کے کرشمے دیکھتی ہے۔ یعنی حسن خارجی اشیا میں بالذات موجود ہے کہ ہر دیکھنے والا اسے حسین دیکھنے پر مجبور ہے یا خود انسان کے باطن میں ہے جس کی بدولت اسے اشیا خوشنما اور خوبصورت نظر آنے لگتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فطرت اہلِ نظر کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خارجی اشیا چاہے بہت حسین و دلکش ہوں لیکن جب تک انسانی نظر ان کے نظاروں سے مسحور نہیں ہوتی، ان کا وجود بے معنی رہتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط نہیں کہ حسن دراصل دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے کیونکہ تتلیوں کا رنگ ہو یا مور کا رقص، کہسار و آبشار کا حسن ہو یا قوس قزح

کے رنگ یا موجوں کا مد و جزر، عام و خاص سب کے لیے یکساں کشش نہیں رکھتے، کیونکہ ایک ہی منظر سے ایک شخص متاثر ہوتا ہے اور دوسرا نہیں، بلکہ یہ لطف اندوزی نظارہ کرنے والے کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی ہے۔ جس طرح چودھویں کا چاند کسی آسودہ حال حسین جوڑے کی نظر میں رومان پرور ہو سکتا ہے لیکن وہی چاند ایک فاقہ کش کے لیے نان شبینہ کا عکس بن سکتا ہے اور پھر ایک شخص ہمیشہ ایک ہی اثر قبول بھی نہیں کرتا جو چیزیں کسی خاص موڈ میں پر کشش اور حسین معلوم ہوتی ہیں وہی دوسرے موڈ میں بے کیف اور بے مزہ نظر آنے لگتی ہیں۔ یوں حسن کا تعلق خارج سے نہیں بلکہ خارج پر نظر ڈالنے والوں کی داخلی کیفیت سے ہے۔ گویا فطرت فی نفسہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اس کے حسین نظاروں کی قدر و قیمت بھی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کوئی صاحب نظر اس کے جمال کی تعریف نہ کرے۔ گویا فطرت کا وجود اپنا آپ منوانے کے لیے فن کار کی نظر کا ممنون احسان ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ خالقِ کائنات نے اس دنیا کو کامل و مکمل صورت میں پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اگرچہ حسن کا تعلق انسان کی داخلیت سے ہے اور خارجی محرکات کا محتاج نہیں البتہ ان کا تعلق خارجیت و داخلیت دونوں کے باہمی ربط سے ہے۔ یعنی خارجی اشیا کے مشاہدے سے ہی انسان کے باطن میں ایک طرح کی حرکت اور تموج پیدا ہوتا ہے۔

فطرت اگرچہ بے ذوق نہیں
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر (12)

محفلِ قدرت ہے اک دریا بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں طوفان حسن (13)

یوں حسن یا فن اپنے اظہار کے لیے مادی وسائل کا محتاج ہے اور فکر مجرد کی صورت میں اس کا تصور تقریباً محال ہے۔ فطرت بذات خود اتنی حسین نہیں ورنہ ہر آنکھ حسن سے مسحور ہو جاتی۔ یہ اقبال کی آنکھ کا کرشمہ ہی ہے جس نے فطرت کے باریک سے باریک منظر کو ہماری آنکھوں میں جیتا جاگتا بنایا۔ اقبال اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں جب خارجی اشیا پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ اشیا بھی اس روشنی میں آجاتی ہیں اور باہم مل کر ایک نئی روشنی کو جنم دیتی ہیں، اس طرح اقبال اپنی شوخی فکر سے فطرت کو نزاکت عطا کرتے ہیں کیونکہ فطرت مجبور محض ہے۔ قبال کے نزدیک فطرت اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ پہاڑوں کا اپنی جگہ قائم و دائم رہنا، صبح اور شام کی وہی وقوع پذیری، ہزارہا سال سے روز وہی باتیں، سورج کا ایک ہی مدار میں گردش کرنا، دن اور رات کا وہی چکر۔ یوں فطرت جہاں بے صورت اور بے ڈھنگ ہوتی ہے، وہاں ایک فن کار ہی اس میں اپنی فنکاری سے ترمیم کر کے اس کے حسن کو سنوارتا ہے کیونکہ فطرت تو خود یہ کام سر انجام دینے سے رہی۔ اس خیال کو اقبال نے اپنی نظم "شبنم" میں یوں ظاہر کیا ہے:

نم در رگ ایام ،زاشک سحر ماست ایں زیر وبر چیست، فریب نظر ماست

انجم بہ بر ماست
لخت جگر ماست
نور بصر ماست (14)

کہ ایام کی نمی در اصل ہمارے ہی اشک سحر کی بدولت ہے اور زندگی کی ساری رنگا رنگی فریب نظر ہے۔ اقبال حسین اشیا کے اجزائے حسن کی فہرست مرتب نہیں کرتے بلکہ اس سے حاصل شدہ تاثر کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک فطرت کے جامد مظاہرات پر انسانی تخیل نے ہی کار آمد اضافے کیے ہیں اور انسان کے تخلیقی عمل نے فطرت کی کوتاہیوں اور کمیوں کو دور کر کے ان میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ نظم "تخلیق" سے مثال ملاحظہ کیجیے:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پر غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا (15)

یوں انسانی ذہن فطرت کی ناہمواریوں کو مکمل شکل عطا کر کے اسے دنیا کی آرائش وزینت کی صورت میں نمودار کرتی ہے۔ اقبال کے نظریۂ فطرت میں یہ خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر اس چیز سے گہری دلچسپی ظاہر کی ہے جو حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پانی، موج، دریا، ندیاں اور ہوائیں وغیرہ جو حرکت اور گردش مدام کے مظہر ہیں، اقبال کے نزدیک مختلف حقیقتوں اور بصیرتوں کے مظہر بن گئے ہیں۔ ''ساقی نامہ'' میں موسم بہار کے نغمے پر کان لگا کر زندگی کا پیام سنتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس موسم میں مظاہر فطرت اپنے مقامات بدلتے رہتے ہیں یوں زندگی بھی حرکت سے خالی نہیں۔

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اُچکتی ہوئی
اٹکتی ،لچکتی ، سرکتی ہوئی
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام (16)

حرکت اور حرارت کا احساس اقبال کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ وہ زندگی میں ٹھہراؤ سے سخت نفرت کرتے ہیں، ساکن پانی کے بجائے متحرک پانی سے زیادہ شغف رکھتے ہیں، گنگناتی گاتی ندیوں کا پر شور بہاؤ اقبال کے لیے دل کشی کا سبب ہے جو پتھر سے اپنا دامن بچا کر ہر لمحہ رواں دواں ہے۔

؎ بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں (17)

انہی متحرک خیالات پر مبنی نظموں میں ''ہمالہ، چاند اور تارے، جوئے آب، ساقی نامہ، شاعر، اور فلسفۂ غم'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کا فطرت کے بارے میں اصلی اور آخری نظریہ ''تسخیر فطرت" ہے اور یہی نظریہ ہمارے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں اقبال حیات و کائنات کے بارے میں اپنے نظریات پختہ کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک اس کائنات کی اٹل حقیقت فرد ہے اور وہ فطرت کی اداؤں کا پارکھ ہے۔ فطرت ہی اس کے مقاصد کا ایک وسیلہ ہے یعنی فطرت انسان کی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اسے تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ بظاہر فطرت کے مقابلے میں انسان انتہائی حقیر ہے لیکن اس کے پاس خدا کا عطا کردہ شعور کا خزانہ ہے جو اسے فطرت سے بالاتر کر دیتا ہے۔ بعض اوقات فطرت کی یکسانی دل بھی اچاٹ کر رکھ دیتی ہے اور انسان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نت نئے جہان پیدا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ انسان تو کائنات ارضی پر اللہ کا نمائندہ ، خلیفہ اور نائب ہے جو نقش کہن مٹانے، خلاؤں کو تسخیر کرنے والا، نئی راہیں تراشنے والا، فضاؤں اور دریاؤں کا رخ موڑنے والا اور رحمانی صفات کا آئینہ ہے۔ خدا نے انسان کو وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کے بل بوتے پر وہ ازل سے فطری اور خام مواد کو حسین تر بنانے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ یہی انسان زمین پر بیٹھ کر عرش کو بھی چھو سکتا ہے اور اپنی خودی کی بدولت آسمان پر کمندیں ڈال سکتا ہے اور اسی کائنات کے اندر رہ کر کرشمے دکھا سکتا ہے۔ اس طرح آخری دور میں اقبال کے ہاں انسان کی برتری اور عظمت کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔

؎ فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیر مقام رنگ و بو کر (18)

یعنی فطرت کو عقل سلیم کے سامنے لا کر اس کے حسن کو چار چاند لگا دیں۔ اقبال فطرت کو ناقص قرار دیتے ہوئے انسان کو اس کی تکمیل کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور مناظر فطرت کی تصاویر دکھا کر ہمیں سراپا عمل

بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یوں انسان اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر دنیا کو منور کرتا ہے اور اپنے عمل صالح کے ذریعے حرکت، حرارت اور مادے کے ممکنات پر قابو پاتا ہے۔ فطرت کے مقابلے میں انسان چونکہ تخلیقی ذہن کا مالک ہے جس کے سبب انسان کی ہستی پوری کائنات میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے اور انہی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر تسخیر فطرت کو یقینی بناتا ہے اور قومیں بھی اس وقت غالب آتی ہیں جب وہ عالم خارجی کو تسخیر کر کے پوشیدہ خزانوں کا کھوج لگاتی ہیں۔ اقوام عالم کا کوئی انقلاب جہان تازہ کے بغیر ممکن نہیں۔ نقش کہن کو مٹا کر ہی جہانِ تازہ کے چراغ روشن کیے جاسکتے ہیں۔

؎ یہی آئینِ فطرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے (19)

قرآن پاک بھی تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے: ترجمہ؛ اور تمہارے لئے مسخر کیا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں سب کا سب اپنے حکم سے۔

اور انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زندگی کی قدروں کو اپنی شخصیت میں نئے سرے سے تخلیق کر کے انھیں نظم وضبط کا پابند بنائے۔ یوں اس جہانِ رنگ وبو کی تخلیق ذات باری تعالیٰ نے کی لیکن اس کی آرائش و زیبائش انسان نے ہی کی۔ اس لیے وہ بھی تخلیق میں خدا کا شریک ہے۔

؎ وہی جہاں ہے تیرا جسے تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہے (20)

اقبال کا منشور ہی حیات و کائنات کے دامن میں جھانکنے کا نام ہے اور اس عریاں کائنات کا لباس و حسن ہے۔ جس طرح اقبال نے دنیائے فطرت سے موازنہ "بال جبریل" میں کیا ہے اور پھر خدا سے شکوہ کیا ہے ۔ انسان اور خدا کی گفتگو میں خدا فرماتا ہے کہ فطرت جیسی ہے۔ اسے ویسا ہی رہنے دیا جائے اور اس کے بدلنے کے متعلق کوئی بات نہیں کہنی چاہیے لیکن انسان اس بات سے اختلاف کر کے کہتا ہے کہ ہاں! فطرت جو ہے وہ تو ہے لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیسی ہو سکتی ہے۔

؎ فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی کو (21)

اقبال کے نزدیک فطرت کا کام خودی کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے اور انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے اس پر غلبہ پائے اور جب یہ انسان کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے تو اقبال اسے حریف قرار دے کر اس پر غالب آنے کا سبق دیتے ہیں بقول نعیم احمد:

"فلسفہ خودی کی تکمیل و تشکیل کے ساتھ ساتھ اقبال کے نظریہ حسن اور فطرت میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔اب جمال کی جگہ جلال نے لے لی ہے ۔بلبل وطاؤس نغمہ ورنگ رہ گئے ہیں۔"(22)

؎کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ(23)

یوں اقبال مناظر فطرت کی تعریف سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا عالمگیر پیغام دیتے ہیں اورانسانیت کی تعمیر میں ایک کائناتی عشق کے جذبات پیدا کرتے ہیں جس سے انسان کا اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا تعین مستحکم ہو جاتا ہے۔

؎نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے (24)

یوں تسخیر فطرت خودی کی تکمیل کے لیے لازم ہے۔ہر قدر حیات انسان کی سعی وجہد کی محتاج ہے اور زندگی کی اصل ہم آہنگی وہ ہے جو انسان نے اپنی کوشش سے پیدا کی ہے۔ پیہم تخلیق کے سبب سے اس کو سکون اور قرار نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ بے قراری اور کشاکش ہی اس کی ذات کی قوت و توانائی اور تکمیل کا احساس کرتی ہے۔انسان اپنے فعال ذہن کی بدولت فطرت سے عظیم تر ہے۔ تخلیق آدم اس لحاظ سے ایک عظیم واقعہ تھا جب روح ارضی آدم کا استقبال یہ کہہ کر کرتی ہے کہ انسان کے لیے خدا نے فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر اور فرمانبردار بنا دیا؛

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک ،یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا ، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ (25)

اور پھر "ساقی نامہ" میں مزید شدید جذبہ ملاحظہ ہو:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے (26)

وہ شاعر جو ابتدا میں درد و غم کے ہاتھوں مجبور، احساس تنہائی سے چور اور جذبہ محرومی سے مغلوب ہو کر مناظر فطرت میں سکون و عافیت کا طلب گار تھا اس مقام پر آکر فطرت کو اپنے لیے عزائم کی جولانگاہ سمجھنے لگا

ہے اور فطرت کی تسخیر اس کی تقدیر بن گئی اور اب رکاوٹوں پر غالب ہو کر خودی کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس عظیم نصب العین میں عشق ہی اقبال کا رہنما ہے۔ وہ عشق کو ہی زادِ راہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ جنون ہے جس کی ہنگامہ آرائیوں کے سامنے فطرت کا دامن بھی تنگ نظر آتا ہے اور پھر فطرت کی تسخیر کو بھی ناکافی سمجھتے ہوئے یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں (27)

فطرت میں اقبال کو خالق کی عظمت کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کائنات میں تدبر ان کے پر تجسس مزاج کا خاصا رہا ہے اور چونکہ فطرت کے کثرت سے نمایاں ہونے والے ارضی و سماوی مناظر ایک اکائی کی صورت میں انسان کو یکجا کرتے ہیں، اس لیے انھوں نے شاعری میں شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان کا ہنر ورانہ استعمال کیا ہے جو انسان کی عظمت اور خودی کو بھی استحکام کی طرف لے جائے اور عرفان خداوندی کے دروازے بھی وا کرتی رہیں۔

یوں فطرت اقبال کے ہاں ان کے چند نمایاں اوصاف میں سے ایک بنیادی وصف ہے جس کو شاعری سے ہم آہنگ کر کے انھوں نے پیش کیا ہے۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ انھوں نے فطرت کو اپنی شاعری کا قائم مقام بنا کر فطرت کے بکھرے رنگوں کو اپنی شاعری کے ڈھانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ فطرت اور شاعری دونوں اقبال کے ہاں لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں فطرت کے تناظر میں ہم آہنگی بے ترتیبی کا شکار نہیں بلکہ درجہ واراس میں استحکام اور پختگی آتی گئی اور ایک ہنر وارانہ نظم وضبط اس کی رگ وپے میں سرایت کرتا رہتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ Chirrs Baldrick . Dictionary of oxford literary terms New York the concise united states.2001 page 167

۲۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان "اقبال اور قرآن" لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۶ء ص نمبر ۱۰۳

۳۔ڈاکٹر عبدالمغنی، "اقبال کا نظریہ فن، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء ص نمبر ۱۰۳

۴۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء ص نمبر ۴۵۰

۵۔ ایضاً، صفحہ حہ ۸۷

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۹

۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۷

۸۔ ایضاً، صفحہ ۵۷

۹۔ ایضاً، صفحہ ۴۰۷

۱۰۔نعیم احمد (مضمون) بشمول: دائرہ معارف اقبال (ج سوم) لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۴ء ص نمبر ۲۳۳

۱۱۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء ص نمبر ۲۲۵

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۶

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۶

۱۴۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی، (مؤلفہ) شرح پیام مشرق، لاہور آرٹ پریس، ۲۸۷، ۱۹۵۳

۱۵۔علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) لاہور، مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء ص نمبر ۹۷۱

۱۶۔ ایضاً، صفحہ ۷۴۲

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۷

۱۸۔ ایضاً، صفحہ ۶۳۶

۱۹۔ ایضاً، صفحہ ر ۱۱۶

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۶۵۴

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔نعیم احمد (مضمون) بشمول: دائرہ معارف اقبال (ج سوم) لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۱۴ء ص نمبر ۲۳۴

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ر ۶۱۸

۲۴۔ ایضاً ص ۴۵۳

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۷۵۹

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۷۴۳

۲۷۔ ایضاً، صفحہ ۶۴۰